eISSN: 2791-0342
pISSN:2791-0334

سہ ماہی "صحیفہ" میں افسانوی ادب کے اردو تراجم: تحقیقی و تجدیدی بازیافت

(Short Stories Translations in the Quarterly 'Saheefa': A Research and Critical Analysis)

ڈاکٹر اسد محمود خان
افسانہ نگار و محقق، لاہور

Dr. Assad Mehmood Khan
Fiction writer and Independent Researcher,
Lahore

Abstract:

Translations of creative literature are very valuable contributions to the literary canon, and esteemed critics such as Wordsworth argued that creative writings should be exempt from scrutiny. West holds the belief that creation surpasses translation. Undoubtedly, the significance of translations cannot be denied. Translations serve as a gateway to other languages, allowing us to explore new realms of literature. Literary journals are the optimal medium for publishing translations. Starting with the twentieth century, Urdu literary journals have consistently emphasised the importance of translation in all its forms. Majils Tarqi e Adab's literary journal "Sahifa" is among them, which is being published since 1957. The inaugural edition of this journal featured a translation of a French short tale, and translations have remained an integral component of the publication ever since. This essay aims to demonstrate the role of Urdu translation in the tradition of short story writing. 'Sahifa' has translated short stories written by renowned and esteemed authors from many backgrounds including French, Russian, English, American, and Bengali, both contemporary and classic.

Key Words: Sahifa, Urdu Language, Translations, Creative Literature, Short Story Fiction,

تخلیق، تجربے اور تخیل کے اظہاریے کا فن ہے جہاں اظہاریہ، احساس اور خیال کی باہمی وارفتگی دراصل ادراک کی تفہیم تک رسائی کا معاملہ ہوتا ہے۔ احساس کے دامن میں تین بنیادی عناصر شامل ہیں: باطنی تجربہ، نفسیاتی ردِ عمل، طرزِ عمل یا اظہاری ردِ عمل، جو مل کر شدتِ جذبات کے درمیان اظہار کی صورت بناتے ہیں۔ باطنی تجربہ ایک زاویہء نگاہ کی تصویر سے محبت، نفرت، حدت، شدت، لذت، ندرت، اجرت، ہجرت، قدرت، حسرت، صورت، عورت، حیرت اور شہرت کی تعبیر تک یا کہیں کہیں اِس سے بھی زائد کا مرحلہ ہوتا ہے جو اظہار کی پہلی خواہش اور کوشش کا قضیہ نبیڑتا ہے۔ احساس اور خیال کی باہمی وارفتگی پروَا ہونے والی ادراک کی کھڑکی کا پہلا منظر نفسیاتی ردِ عمل، طرزِ عمل یا اظہاری ردِ عمل کی تخلیق ٹھہرتی ہے جو تخلیق کار کی شدتِ جذبات کا حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح تجربے کا میدان وسیع ہوتا ہے، اُسی طرح تخیل اور تخلیق کا

میدان بھی ایک بحرِ بیکراں کی صورت تخلیق کار کے سامنے کھلتا اور بڑھتا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔ راحیل فاروق، "تخلیق فن: ایک نامیاتی نظریہ" میں لکھتے ہیں:

> " تخلیق کا عمل ایک جذباتی کیفیت اور تبدیلی کا تجربہ ہے، جس کے نتیجے میں اس کا تجزیہ کرنا یا دوبارہ حاصل کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس تجربے کی نوعیت یا حالت کو سمجھنے کی کوششوں کا نتیجہ اکثر ہمارے ذہنوں میں ایک مبہم اور کبھی کبھار غلط تصویر کشی کا باعث بنتا ہے، حالانکہ اس رجحان کا بنیادی مادہ اس لمحے بھی غیر واضح ہوتا ہے۔"(1)

نینسی اینڈریسن، نے "تخلیقی صلاحیت اور لاشعور" میں لکھا ہے:

> "ہر کوئی ایک مشترکہ تجربے کو بیان کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تاثرات استعمال کرتا ہے، شعور کی سطح سے نیچے کچھ گہرائی سے خیالات کا بہاؤ، بلکہ تجربے کی لاشعوری جہتیں (پہلو یا ذرائع) اس کا ذریعہ ہیں جسے تخلیقی صلاحیت کہا جا سکتا ہے۔"(2)

ایک طرف ہمارے گرد و پیش ماحول اور ماحول میں ہونے والی تبدیلیوں کا واسطہ یا بالواسطہ اثر، خیال کو جنم دیتا ہے جس کے ایک کنارے پر تخلیق کار اور دوسرے پر تخلیق خود کا وجود کھوجنے، سوچنے اور سنوارنے کی کوشش میں سرگرداں دکھائی دیتی ہے۔ دوسری جانب یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ ہم ایک کہانی میں ایک کہانی کار ہوتے ہیں۔ بے شک ہمارا سماج بڑے کینوس کی ایک کہانی کی قبول صورتی ہے جہاں فرد ایک ہی وقت میں کہانی کا کردار اور ایک ہی وقت میں کہانی کار بھی ہوتا ہے۔ یعنی کہانی، سماج کی کڑی ہے جو ہر بدلتے لمحے میں تخلیق سے گزرتی ہے البتہ کبھی تخلیق کار کہانی کا کشٹ سہتا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی کہانی تخلیق کار پر کشف کھولتی ہُوئی دکھائی دیتی ہے۔ بہر طور دونوں صورتوں میں تخلیقی عمل کا حظ، تخلیق، تخلیق کار اور قاری کے لیے موجود ہوتا ہے۔ تخلیقِ کائنات کے ساتھ جو پہلی شے توجہ اور کشش کا سبب بنی، وہ کہانی اور کہانی کار تھا۔ انسانی تخلیق کی پہلی خواہش پر اُتری خاموشی اور انہماک کی وجہ بھی کہانی بنتی ہے، یُوں فطری طور پر کہانی کی جڑت، انسانی رویوں میں شامل ایک غالب رویے جیسی ہے جو زمینوں، زمانوں کی مسافت و مسافرت سنبھالے کہانی در کہانی اور کہانی کار در کہانی کار منتقل ہوتی چلی جاتی ہے جس کا سفر ہنوز جاری بھی ہے اور باقی بھی ہے۔ یہ بھی حقیقت دکھائی دیتی ہے کہ جب انسان نے سننے، کہنے یا سہنے کے تجربے کی صورت گری کی کوشش کی ہو گی تو زبان و بیان کی کسی بھی صورت میں یقیناً کہانی کی پہلی صورت گھڑی ہو گی۔ کہانی کی ایسی صورت کے بارے میں پروفیسر ظہور الدین رقمطراز ہیں:

> "کہانی کاری، ایک ادب صنف ہے جس کا مقصد تجربات، کیفیات، جذبات اور واقعات کو منطقی اور منظم انداز میں پیش کرنا اور قاری کے مخصوص جذباتی ردعمل کو جنم دینا اور انہیں دکھائے گئے تجربات اور واقعات میں کی مسافت میں شامل کرنا ہے جو ایک لامحدود مسرت سے بھرپور ہو گا۔"(3)

بے شک باطن میں جاگنے والے کردار کی اَن کہی کہانیوں کا ادراک تخلیق کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے لیکن اِن اَن کہی کہانیوں کو سہنے اور کہنے کا عمل، دراصل تخلیقی عمل کہلاتا ہے جو ایک طرف برداشت کی اذیت سے نجات دلاتا ہے تو دوسری جانب کہانی کے زندہ وجود سے مکالمے کی صورت پیدا کرتا ہے۔ مایا اینجلو ایک جگہ لکھتی ہے: "اپنے اندر ایک ان کہی کہانی کو برداشت کرنے سے بڑا کوئی اذیت نہیں ہے۔"(4) جب کہ

کہانی کے تخلیقی عمل اور کہانی کار کے تخلیقی عمل کے مشقتی حظ بارے ارنسٹ ہیمنگوے رقمطراز ہے: " تخلیق کچھ نہیں ہ، بس آپ ایک ٹائپ رائٹر پر بیٹھ کر خون بہاتے ہیں۔"(5)

کہانی کی پہلی شکل قصہ اور تبدیلی مدارج کے سفر کی پہلی سیڑھی داستان کہی جاتی ہے۔ کہانی اور قصہ گوئی کا معاملہ انسانی تخلیق اور ترویج جتنا قدیم دکھائی دیتا ہے یہاں تک کہ اول اول کہانی اور قصے کی شروعات کو یونانی اور قدیم مصری تاریک سے کشید کیا جاتا ہے۔ فنِ داستان گوئی نے جہاں کہانی کے انداز و اطوار میں پہلی اصلاح متعارف کروائی وہاں کہانی کے ارتقائی مراحل کی داغ بیل بھی رکھی جس نے آگے چل کر نثری اصنافِ سخن میں اپنی اپنی الگ پہچان متعارف کروائی۔ مصری سرزمین کے ساتھ ساتھ قصہ، داستان اور کہانی کی دوسری بڑی جنم بھومی، ہندوستانی زمین کو سمجھا جاتا ہے جہاں قدیم ہندی ویدی ادب میں کئی کہانیاں مل جاتی ہیں۔ البتہ! باقاعدہ داستان گوئی کے مکمل لوازمات کا حامل ادبی شاہ پارہ ملا وجہی کا 'سب رس' مانا جاتا ہے جب کہ دیگر اہم داستانوں میں قصہ گل وہرمز، داستان امیر، توتا کہانی، سنگھاسن ابتدائی ادوار کی کامیاب کہانیوں کی شکل سمجھی جاتی ہیں۔ کہانی، قصے اور داستان کے دور سے باہر نکلی تو ناول اور افسانہ کی صورت نئی روایت کا دامن پھیلا رہی تھی۔ کہانی کے بدلاؤ اور سفر بارے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

> "اردو ادب میں تذکرہ نویسی، تنقیدی روایت، داستان گوئی اور قصہ گوئی کی جگہ کہانی کاری، ناول نگاری اور مختصر افسانہ نگاری جیسی نئی ادبی اصناف نے حاصل کرلی ہے جو پہلی بار ایک ایسے مقام پر پہنچی ہے جہاں عالمی ادبی روایت ورجحانات کے ہم آہنگ ہونے کی خواہش پوری ہوتی ہے۔"(6)

کہانی کا دامن، ترجمے کی کناری سے جہاں خوشنما ہوتا ہے وہاں وسیع و عریض بھی ہو جاتا ہے۔ کہانی کار، احساس، خیال اور ادراک کی زبان جانتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ زمان و مکان کی حدود میں اپنی پہچان رکھتی، بناتی اور بنانے کا مزاج رکھتی ہے۔ زمین وزمان کی وسعت پذیری نے جہاں کہانی، کہانی کار اور قاری کی زبان و بیان کا حلقہ تاثیر وسیع کیا وہاں احساس، خیال اور ادراک کی اثر پذیری کا دائرہ بھی بڑھا دیا ہے۔ یُوں انفرادی فکر و تہذیبی شعور نے اجتماعیت کا سفر طے کیا ہے۔ آج ایک سے زائد زبانیں، ایک سے زائد کرنسی اور ایک سے زائد فکری رابطوں کا اظہاریہ معاشی، معاشرتی اور تہذیبی معاملات کو بطریق احسن نبھانے میں معاون و مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ اجتماعیت کے سفر میں فکری شعور کی ترجمانی نے تراجم کی راہ ہموار کی اور دیگر کئی اصناف کے ساتھ کہانی خصوصاً ناول اور افسانہ اجتماعیت کے سفر پر کہانی کار کی زبان سے کئی دوسری زبانوں میں داخل ہو گئی۔ کہانی کا زبانی پیرہن بدلنے کی ضرورت و اہمیت تبھی اپنی جگہ طبنا گئی تھی جب معاشی و معاشرتی ضرورتوں نے تجارت اور لین دین کے تقاضوں کے پیش نظر باہمی روابط کو رائج کیا اور مشترکہ زبان و بیان کی خواہش و کوشش نے جنم لیا۔ اگرچہ مالی معاملات نے فکر شعور اور علمی و ادبی ضرورتوں کے فروغ میں بھی ایک اہمی اور بنیادی کردار ادا کیا جس نے اجتماعی فکر شعور کی بنیاد رکھی اور ایک جامع کہانی کی سمت سفر بڑھایا۔ باہمی ارتباطی مکاتب و ابلاغ کی خبر گیری نے تراجم کی اہمیت کو کئی چند بڑھاوا دیا اور ایک نئی، مربوط اور جامع صنفِ ادب کی تازہ کاری کو پروان چڑھایا۔ ترجمہ، دراصل ایک مقام سے دوسرے مقام، ایک ملک و قوم سے دوسرے ملک و قوم یا ایک زبان سے دوسری زبان، ایک کہانی سے دوسری کہانی، ایک کہانی کار سے دوسرے کہانی کار میں منتقلی کا سفر طے نہیں کرتا بلکہ ایک فکر، ایک شعور، ایک تہذیب منتقلی کے سفر سے گزرتی اور جگہ بناتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں:

"ترجمہ نگاری، زبان میں نئے تصورات کو متعارف کرانے کی اجازت دیتی ہے جس میں علمی انضمام اور توثیق کا عمل جاری رہتا ہے۔ مزید بر آں زبان کا حصول مؤثر طریقے سے بات چیت کرنے کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے اور نئے مواقع فراہم کرتا ہے۔"(7)

سیفٹکو، نکولس نے انتھونی برجیس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"ترجمہ صرف الفاظ کا معاملہ نہیں ہے: یہ ایک پوری ثقافت کو فہم بنانے کا معاملہ ہے۔"(8)

مشرقی ایشیا اور اس سے آگے ثقافتی حدود میں ایتالو کالوینو کے حوالے سے لکھا ہے:

"ترجمہ کے بغیر میں اپنے ہی ملک کی سرحدوں تک محدود رہوں گا جب کہ ترجمہ مجھے دنیا سے متعارف کراتا ہے۔"(9)

جیلانی کامران، "ترجمے کی ضرورت و اہمیت" میں لکھتے ہیں:

"ترجمہ نگاری، جہاں انسانی علم کو وسعت دینے اور ذہن کے افق کو وسیع کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، وہاں ثقافتی اور فکری ضرورتوں کو بھی مخاطب کرتی ہے۔ دوسرے ترجمہ کا عمل لسانی ساخت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے جو نئے علوم سے آشنا ہونے کے لیے ذہن کو مختلف انواع سے روشناس کرتا اور فکر و عمل کے نئے اور اختراعی طریقے دریافت کرنے میں مدد دیتا ہے۔"(10)

یہ ایک ادبی حقیقت ہے کہ ترجمے کا دامن جتنا خوشنما دکھائی دیتا ہے، اُتنا وسیع و عریض بھی ہوتا ہے۔ ترجمہ ہوتا کیا ہے اور کیا اِس کی تعریف، تفہیم کا معاملہ سلجھا سکتی ہے۔ لفظ ترجمہ عربی زبان سے مشتق ہے جو ساخت اور معانی کے اعتبار سے ایسے ہی اردو زبان و بیان میں شامل ہُوا ہے۔ تعریف و تفہیم کے اعتبار سے ترجمہ: ایک کام یا کارروائی یا ایک کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اُٹھائے گئے اقدامات یا اقدامات کا سلسلہ جو ایک زبان سے دوسری زبان میں پیش کیا جائے یا ایک مختلف مادہ، شکل، یا ظاہری شکل میں تبدیل کرنے کا عمل ترجمہ ہو گا۔ کسی دوسری زبان میں لکھی یا بولی جانے والی کسی چیز کو تبدیل کرنے کا عمل؛ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل یا سلسلہ؛ تحریر یا تقریر کا ایک ٹکڑا ہے جو کسی دوسری زبان سے منتقل کیا گیا ہے؛ بولے گئے یا تحریری الفاظ جو ایک مختلف زبان میں تبدیل ہو گئے ہیں؛ کسی چیز کا ایک زبان سے دوسری زبان میں اظہار کرنے کا عمل؛ ایک زبان کی لغت کو دوسری زبان میں بیان کرنا، ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کیا ہوا یا منتقل کیا ہوا (مطلب و معنی)؛ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی چیز کا تحریری یا زبانی لفظی بدلاؤ جو ایک ہی معنی رکھتا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد ترجمے کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"ترجمہ نگاری، ایک تخلیقی کھڑکی کے طور پر کام کرتی ہے جس کے ذریعے ہمیں مختلف ممالک کی کہانیوں اور کرداروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ تاہم عصر حاضر میں اس کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے جو عالمی فکری اور ادبی معاملات میں ہماری شمولیت کے لیے ضروری ہیں۔"(11)

گوئٹے لکھتا ہے:

"جو مترجم اپنے آپ کو کم و بیش اپنے اصل سے جوڑتا ہے وہ اپنی قوم کی اصلیت کو ترک کر دیتا ہے اور یوں ایک دوسرا وجود عمل میں آتا ہے جو سب سے پہلے ایک مشترکہ تخلیقی حظ کو محسوس کرتا ہے۔"(12)

ترجمہ نگاری کا فن، تخلیق کار کا آئینہ ہے، ترجمہ نگار کا نہیں کہ تخلیق میں تخلیق کار اپنے پُورے قد کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور ترجمے میں اس قد کا قائم رہنا دراصل ترجمہ نگار کا قد بڑھاتا ہے۔ سماجی، معاشرتی، لسانی، فکری اور زبان و بیان کی ترسیل اور ترقی دراصل ایک بڑے کینوس پر جمع ہونے والے کہانی کا منظر نامہ بنتا ہے جہاں کئی منظر ایک وقت میں کئی کرداروں کے روپ میں ایک تخلیق کار کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں۔ تاریخچوں میں درج کہانیوں سے ترجمہ نگاری کی روایت کا سرا پکڑنے میں آسانی ہو جاتی ہے جہاں مصر و بغداد اور ایران کے علم و ادب کے علم برداروں نے زبان و بیان کی قید سے بالاتر ہو کر علمی و فکری شعور کی تاثیر سمیٹے شاہ پاروں کو اپنی اپنی مروجہ زبانوں میں منتقل کرنے کا جان جوکھم کشٹ کاٹا اور اپنی اپنی سلطنتوں کے طول و عرض میں علمی و فکری خزانوں کو بانٹنے کا اہتمام کیا۔ اردو زبان میں ترجمہ نگار کے فن کی ابتداء پندرھویں صدی کے آخر میں اپنی اولین صورت کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ یہاں ترجمے اور تشریح کے درمیاں موجود ایک باریک لکیر کہیں کہیں اپنا راستہ بدل جاتی ہوئی بھی دکھائی دیتی ہے لیکن بہر طور بڑی منزل کے حصول میں چھوٹی مشکلات سہہ جانا کامیابی کی دلیل بنتا ہے۔ پروفیسر مسکین علی حجازی، ترجمے کی ایسی مشکل صورتی بارے لکھتے ہیں:

" زبانوں کے درمیان علمی ادبی اور تخلیقی مواد کا ترجمہ کرنا ایک انتہائی محنت طلب کوشش ہے جس کے لیے نہ صرف موضوع، ادب یا فن کی مخصوص صنف میں مہارت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ دونوں زبانوں میں مکمل عبور کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔"(13)

ڈاکٹر جمیل جالبی کو ترجمہ نگاری کی مشکلات کا ادراک حاصل تھا جس کا اظہار یُوں کرتے ہیں:

"ترجمہ ایک مشکل کام ہے جو مترجم کی انفرادیت، خیالات اور تحریر کے انداز سے پیچیدہ طور پر جڑا ہوا ہے۔ ایک طرف، مترجم جس زبان کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کی ثقافت کی طرف متوجہ ہوتا ہے، لیکن دوسری طرف، جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے، اس کی ثقافت مترجم کی اپنی شناخت کو مجروح کرتی ہے۔(14)

سولہویں اور سترھویں صدی میں اردو زبان و ادب نے فکری و شعوری سطح پر ترقی و ترویج کی نئی منازل طے کیں اور یہی وہ دور رہا کہ جب ترجمہ نگاری نے بھی ادبی صنف کے طور پر اپنی بہتر شناخت کی سمت سفر طے کیا۔ مغلیہ دورِ حکومت میں فنونِ لطیفہ کی مجموعی ترقی اور بہتری نے علم و ادب کی ترقی کے کئی باب لکھے جن میں ایک باب ترجمہ نگاری کا بھی شامل تھا۔ تاریخی حوالوں کی چھان بھٹک کے بعد اردو میں ترجمہ کی روایت کا حاصل پہلی تصنیف عبد اللہ حسینی کی 'نشاۃ العشق'، کچھ حوالوں میں شاہ میراں جی کی 'تمہیداتِ ہمدانی اور بعض حوالوں میں ملا وجہی کی 'سب رس' کو قرار دیتے ہیں۔ بہر طور سترھویں صدی نے ترجمہ نگاری میں کئی اہم اہداف عبور کیے اور سفر بڑھایا جو شاہ ولی اللہ کی تصنیف 'معرفت السلوک' تک گیا۔ اٹھارویں صدی کے آغاز نے 'طوطی نامہ'، 'کربل کتھا'، 'چندر بدن مہیار'، اور 'یوسف و زلیخا' نے کمالِ فن کی جانب قدم بڑھائے۔ شاید! ایسی ہی کسی صورت کو محسوس کرتے ہُوئے ڈاکٹر سید عابد حسین عابد لکھتے ہیں:

"ترجمہ اس وقت ادبی خوبی حاصل کرتا ہے جب وہ اصل کام کے معنی، جوہر، باریکیوں اور جمالیاتی خوبیوں کو دوسری زبان میں کامیابی کے ساتھ پہنچاتا ہے۔"(15)

ماریس بلانچوٹا ایسی ہی صورت بارے رقمطراز ہے:

"مترجم زبانوں کے فرق کا راز دار ہوتا ہے، ایک ایسا فرق جسے وہ ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، بلکہ اسے استعمال کرتا ہے جب وہ اپنی زبان پر متشدد یا لطیف تبدیلیاں لاتا ہے، اس طرح اس کے اندر اس کی موجودگی بیدار ہوتی ہے جو اصل میں اصل سے مختلف ہے۔"(16)

انیسویں اور بیسویں صدی نے شعوری، فکری اور لسانی ترقی کی نئی منازل طے کیں اور خصوصاً کہانی نگاری جس میں ناول بالعموم اور افسانہ بالخصوص اپنی نئی شکل وصورت کے ساتھ دنیائے ادب میں نمودار ہُوا۔ آج خبروں کی بہتات کے درمیان جہاں کہانی کی شکل وصورت بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے مخلص اور حقیقی تخلیق کار کی ضرورت ہے وہاں ایک جاندار اور اصلی مترجم کی ضرورت کہانی کی ضرورت بن چکی ہے۔ موجودہ ترقی وتیزی نے زبانوں کی دوری ایک بٹن کی دوری پر رکھ دی ہے جہاں قاری خود کی پسند کو من مرضی کے زبانی قالب میں ڈھال کر چاہ اُتار سکتا ہے لیکن تخلیق اور ترجمے کی تاثیر کا حظ نہیں لے سکتا۔ ایسی صورت میں ترجمہ نگاری کا فن جہاں وقتی اہم ضرورت بن جاتا ہے وہاں مترجم تخلیقی عمل کا ایک اہم ستون ہو جاتا ہے جس پر اجتماعیت کی فکری وتہذیبی عمارت سلیقہ مندی بلندیوں کی جانب اُٹھتی دکھائی دیتی ہے۔ شعور اور تہذیب یا تہذیب اور شعور باہمی پیش رفت، ترقی اور وسعت کا معاملہ ہے جہاں اولذکر خوبیوں کی ترتیب کہیں کہیں پر ادل بدل بھی ہو سکتی ہے جو معاشرت وتہذیب کی ترقی اور شعور کی ترقی، تربیت اور ترتیب کا دوطرفہ رویہ ہو سکتا ہے۔ البتہ تہذیبی شعور، فکری شعور کا شاخسانہ دکھائی دیتی ہے جہاں فنونِ لطیفہ اور بالخصوص علم ادب کی ترقی، تربیت اور ترتیب کلیدی کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ فکری شعور نے فکر وخیال، تخلیق وتحقیق کی رو میں جنم لینے والی اصنافِ ادب کی پرورش کی جس نے ادبی شعور کا دامن وسیع تر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

کہانی کی مسافت میں داستان، ناول، افسانہ نے پہلے پہل کیفیتِ فکر وخیال کی تاثیر کو تخلیق کار کی زبان وبیان کا لبادہ پہنایا اور بعد ازاں اُسی تاثیر کو کیفیتِ ادراک بخشا۔ فکر وخیال اور ادراک نے زبان کا دامن وسیع کرنے کا سامان کیا جس نے کئی صورتوں کو جنم دیا جن میں ایک تراجم اور دوسری رسائل وجرائد کی صورت بھی تھی۔ خصوصاً تراجم کی صنف نے جہاں اردو ادب کو نئی اصنافِ ادب سے روشناس کرانے کا سامان کیا وہاں فکر وخیال کی ندرت، موضوعات کی وسعت اور تازہ تخلیقی رجحانات عطا کرنے کا سامان بھی کیا۔ تخلیق کی ترسیل کا موثر کتابی پیرہن ہوتا ہے لیکن دیگر معاون ذرائع جن میں رسائل وجرائد ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، کا کردار بھی سراہے جانے کے لائق رہا ہے۔ معیاری، سنجیدہ اور چنیدہ تخلیقات کو گاہے گاہے قاری کی بصارت وبصیرت کے حوالے کرنے کا کارہائے نمایاں بھی ادبی رسائل وجرائد کا خاصہ رہا ہے۔ ادبی رسائل وجرائد کسی بھی زمانے کی ادبی تاریخ کا ایک مستند حوالہ ہوتے ہیں جو مخصوص زمانوں کے تخلیقی میلان ورجحان، اصنافِ ادب کی ترویج وتوضیح، تخلیق، تحقیق اور قاری کے مابین کے تعلق کی زندہ دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔ قیامِ پاکستان سے تاحال شائع ہونے والی ادبی رسائل، جرائد اور کتابی سلسلوں نے ادبی معاونت کے لیے اپنے حصے کا کام سلجھانے کی سعی کی ہے جن میں چنیدہ محمد طفیل کا ادبی مجلہ نقوش لاہور، آغا شورش کاشمیری کا ہفت روزہ چٹان لاہور، چودھری برکت علی کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہنامہ قومی زبان لاہور، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کا سہ ماہی ادبیات، عبدالرحمان چغتائی کا نیرنگِ خیال لاہور، محمد شفیع کا چار ماہی اورئینٹل کالج میگزین، تاجور نجیب آبادی کا ادبی دنیا جب کی چند دیگر اہم ادبی مجلوں میں اردو ادب، انشاء، مخزن، سیپ، اوراق، نگار، احساس، حروف، قند، ماہِ نو، مکالمہ، نقاط، قرطاس اور صحیفہ شامل ہیں۔

ادبی رسائل و جرائد نے کشتِ ادب پر تخلیق، تحقیق اور تنقید کی جن کیاریوں کی آب یاری کی اُن میں سے ایک کیاری غیر ملکی زبانوں سے کشید کی گئی کہانیوں، افسانوں اور افسانچوں کی ہے جہاں ہمہ جہتی و ہمہ رنگی کا وصف دکھائی دیتا ہے۔ انگریزی ادب سے اردو ادب میں تراجم کی روایت ہمیشہ سے ادبی مجلات کی ترجیحات میں شامل رہی ہے جہاں تراجم کی اس روایت میں متنوع اصناف ادب کی ترجمہ نگاری شامل رہی ہے۔ خصوصاً کہانی اور کہانی سے جڑی صورتوں کی علمی و ادبی تراجم خاصے کی شے دکھائی دیتے ہیں۔ ادبی مجلات میں کہانی کے تراجم کی نمائندگی متنوع المزاج دکھائی دیتی ہے جن میں مجلہ صحیفہ کی روایت کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ مجلہ صحیفہ میں شامل تراجم کو خصوصی طور پر دو بنیادی ادوار کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے جہاں صحیفہ کے یہ ادوار صحیفہ کے اداراتی ادوار کے ادبی مزاج کا حاصل ہیں۔ صحیفہ کا پہلا اداراتی دور سید عابد علی عابد کی زیر ادارت سال 1957ء میں شروع ہوا اور تواتر سے ادبی اور خصوصاً تخلیقی نثری صورتوں کی اشاعت کا سبب بنا رہا ہے جب کہ دوسرا دور احمد ندیم قاسمی کی زیر ادارت رہا جس کا مزاج علمی و ادبی حوالوں سے الگ شناخت رکھتا ہے۔ مذکورہ تحقیقی مضمون کو اول الذکر دور تک محدود کیا گیا ہے تاکہ افسانوں کے تراجم کو بنیادی ادبی ضرورتوں کے درمیان رکھ کر سیر حاصل بحث اور نتائج اخذ کیے جا سکیں۔ سید عابد علی عابد کی زیر ادارت شائع ہونے والے پہلے انتالیس شماروں میں جن عالمی افسانہ نگاروں کے افسانوں کو شامل کیا گیا ہے ان میں فرانسیسی افسانہ نگاروں میں اناطول فرانس اور گائیدی موپساں، روسی کہانی کاروں میں انتون چیخوف اور الیگزینڈر پشکن، انگلش افسانہ نگاروں میں آرنسٹ ہیمنگوے، الزبتھ گیسکل اور ولیم فریر ہاروے، امریکی کہانی کار ٹینیسی ولیمز جب کہ بنگالی افسانہ نگار عبدالغفار کے افسانوں کے تراجم شامل ہیں۔

مجلہ صحیفہ میں شامل کردہ ترجمہ شدہ افسانوں میں سب سے پہلا افسانہ فرانسیسی افسانہ نگار اناطول فرانس کے افسانے کا ترجمہ "خیابانِ ایقبیور" ہے جو صحیفہ کے شمارہ چودہ میں شامل ہے اور جسے شیر محمد اختر نے ترجمہ نگاری کی فنی مہارت سے اردو افسانوں میں شامل کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اناطول فرانس (1844ء1924ء) ایک شاعر، افسانہ نگار اور کہانی کار تھا جس نے اپنے زمانے میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا تخلیقی ادب، قاری کے حوالے کیا اور سال 1921ء میں ادب کا نوبل انعام بھی جیتا ہے جو اس کی ان شاندار ادبی کامیابیوں کے اعتراف تھا، جس کی نشاندہی اسلوب کی انفرادیت، گہری انسانی ہمدردی، اور ایک حقیقی کہانی کاری کے مزاج ے مقابل تحسین کا معاملہ تھا۔ افسانہ کا بنیادی خیال، حقیقت، سائنس اور خیال کی تکوین کا معاملہ سنوارنے کی ایک کوشش ہے جہان منفرد اسلوب اور برتاؤ کے سبب کہانی، قاری پر ایک تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ کہانی میں خود کلامی اور منظر کا بدلاؤ جدید کہانی کاری کے اسلوب کی دین ہے جو اس دور میں افسانہ نگاری میں نئی جہات متعارف کرانے میں مصروفِ عمل تھا۔ خیال کی ایک لہر پر بننے والے منظر کو فرانس یوں کھولتا ہے:

> "ایک نو سالہ بچی جو میرے نزدیک دنیا کے بڑے بڑے داناؤں سے زیادہ عقلمند ہے۔ اس نے مجھ سے
> ابھی ابھی کہا ہے کہ انسان کتابوں میں جو کچھ دیکھتا ہے، اسے وہ باتیں حقیقت میں میسر نہیں آ سکتی کیوں
> کہ وہ باتیں بہت ہی دور افتادہ ہوتی ہیں یا وہ ماضی سے تعلق رکھتی ہیں۔"(17)

ترجمہ نگاری کی مہارت نبھانے والے شیر محمد اختر، حلقہ ارباب ذوق کے بانی اراکین میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے مختلف علمی اور تخلیقی شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں جن میں افسانہ نگاری اور ترجمہ نگاری زیادہ اہمیت کی حامل ادبی خصائص ہیں۔

مجلہ "صحیفہ" میں شامل اگلا افسانہ فرانسیسی افسانہ نگار گائیدی موپساں (1850ء-1893ء) کے افسانہ کا ترجمہ ہے جسے سید سجاد باقر رضوی (1928-1992) نے "غولا" کے نام سے ترجمہ کیا اور مجلہ صحیفہ کے شمارہ دو میں شائع ہوا ہے۔ موپساں عالمی افسانہ نگاری کا وہ معتبر حوالہ ہے جس نے افسانہ نگاری کی روایت مین مختصر کہانی کاری کو متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ، ایک حقیقت پسند کہانی کار کے طور پر، ان

تمام وہموں کو بے نقاب کرتا ہے جو لوگوں کے اپنے بارے میں، اپنے مقاصد اور ان سماجی قوتوں کے بارے میں ہیں جن کا وہ ایک حصہ ہیں۔ نتیجتاً، وہ کبھی کبھار جنونیت کا شکار ہو جاتا ہے لیکن یہی انداز اور اسلوب موپساں کی کہانی کاری کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے۔ افسانہ "غُولا" خطوط کی تکنیک میں لکھا گیا ایک خوب صورت افسانہ ہے جس کا بنیادی خیال انسانی خواہشات اور سماجی مجبوریوں کی بے رحم عکاسی کے ساتھ پس پشت بڑھنے والے منظر نامے کو قاری کے مقابل وَا کرنا ہے۔ "غُولا" میں کے اسرار و رموز کھولتے ہوئے موپساں الفاظ کا پیکر یوں بناتا ہے:

> "کتنی پیچیدہ ہیں اس ان دیکھی دنیا کے اسرار و رموز۔۔! ہم اپنے ناکارہ حواس کے ذریعے اس کی گہرائیوں کا سراغ نہیں لگا سکتے، ان آنکھوں کے ذریعے جن کو نہ بہت چھوٹی چیز نظر آئے، نہ بہت بڑی، نہ بہت نزدیک سے کچھ دکھائی دے، نہ بہت دور سے، نہ یہ ستاروں کی مخلوق دیکھ پائیں، نہ پانی کے قطرے میں بسنے والے جاندار۔۔۔!!!"(18)

عالمی افسانوں میں ایک معتبر حوالہ انطون چیخوف (1869ء-1904ء) کا ہے جو افسانوں میں حقیقت نگاری کو برتنے کے لیے انفرادی شناخت رکھتا ہے۔ اس کے افسانوں میں کرداروں کا شعوری دھاگوں سے جڑا ہونا، کہانی میں کہانی کار کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی بیشتر کہانیاں تیسرے شخص کے نکتہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ مجلہ "صحیفہ" کے شمارہ آٹھ میں اس کا افسانہ "بدنصیب" شامل ہے جسے سجاد ترمذی نے ترجمے کے قالب میں ڈھال کر قاری کے مقابل پیش کیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار صوفیہ، انسانی نفسیات اور سماجی حرکیات کے درمیان ایک متنوع مزاج کا حامل رویہ رکھتی ہے جہاں امید، زندگی کی حقیقتوں کے درمیان راستہ تلاشتی ہے اور روشنی نئی منزلوں کا پتا بتاتی ہے۔ کہانی کو افسانوی پیرہن میں ڈھالتے ہوئے چیخوف منظر لکھتا اور سجاد ترمذی منظر بناتا ہے:

> "یہ اس کی آخری امید تھی اور جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ باہر نکل گئی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی لیکن صوفیہ کو اس ہوا یا تاریکی کا قطعاً احساس نہیں ہو رہا تھا۔۔ وہ چلتی گئی۔۔ ایک مغلوب اور بے بس کر دینے والی قوت اسے آگے ہی آگے لیے جا رہی تھی۔"(19)

مجلہ "صحیفہ" میں شامل اگلا افسانہ روسی افسانہ نگار الیگزینڈر پشکن (1799ء-1837ء) کا "تابوت ساز" ہے جو مجلہ "صحیفہ" کے شمارہ چار میں شامل ہے اور جسے مسعود سلمان نے ترجمہ کیا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار پر خوف ایک خواب میں منظر بنتا اور قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ کہانی کا اسلوب نفسیاتی تہہ داری کا شاخسانہ ہے جہاں کردار، خیال کی گھمن گھیری میں کچھ ایسا گم ہو جاتا ہے کہ اسے خود کا وجود مردہ دکھائی دینے لگتا ہے جسے ایک تابوت میں رکھ کر کھینچا جا رہا ہے۔ یہاں انسانہ نفسیاتی تہہ داری کو سماجی تناظرات میں رکھ کر کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار کا خوف اور خواب بیان کرتے ہوئے پشکن منظر بنتا ہے:

> "تابوت ساز پر خوف کے سامان کا بچا کچا حصہ جنازہ بردار گاڑی پر لادا جا چکا تھا اور دو مریل سے گھوڑے چوتھی بار اسے گھسیٹ رہے تھے۔"(20)

عالمی انگریزی افسانہ نگاری میں ایک اور معتبر حوالہ آرنسٹ ہیمنگوے (1899ء-1961ء) کا ہے جس کی مختصر افسانہ نگاری کی صلاحیت میں اکثر ذاتی تجربات کی عکاس ہوتی ہیں۔ مجلہ "صحیفہ" کے شمارہ چودہ میں شامل افسانہ "دیارِ غیر" کو ترجمے کے قالب میں ڈھالنے کا کام عنایت الٰہی ملک نے کیا ہے جو ایک خوب صورت کہانی کو کمال کہانی بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ افسانہ کی مہارت اور صداقت پر اس کی توجہ ایک ایسی عمیق دنیا تخلیق کرتی ہے جو کہانی کو ختم کرنے کے کافی عرصے بعد بھی قاری کے ساتھ گونجتی ہے۔ "دیار غیر" کی بنیادی خصوصیات میں زبان

دانی کی مہارت کے ساتھ برتاؤ جو اسے مختصر کہانی کے قالب میں بھرپور انداز میں شامل کرتا ہے جب کہ موضوعاتی گہراؤ، منظر نامے کی ترتیب، اور بظاہر سادہ نثر کے ساتھ گہرے جذبات کو ابھارنے کی صلاحیت، افسانے کا مجموعی تاثر بناتی ہے۔ "دیارِ غیر" میں کہانی کی منظر نگاری ہیمنگوے کی کہانی کاری کا خاصا دکھائی دیتا ہے:

"برف باری اور سردی بڑھ جانے سے جلد ہی اندھیرا پھیل جاتا اور پھر برقی قمقمے روشن ہو جاتے۔ گلیوں میں چلتے پھرتے کھڑکیوں کے اندر جھانکنے میں بڑا لطف تھا۔ بند دکانوں کے چھجوں کی اوٹ میں بہت سے جنگلی پرندے اور دوسری شکاری جانور سردی اور برف باری سے پناہ لیے ہوئے تھے۔"(21)

مجلہ "صحیفہ" میں شامل اگلا افسانہ انگریزی افسانہ نگار الزبتھ گیسکل (1810ء-1865ء) کا "دوسری شادی" ہے جو مجلہ "صحیفہ" کے شمارہ نو میں شامل ہے اور جسے سجاد ترمذی نے ترجمہ کیا ہے۔ گاسکل، سماجیات میں رچی بسی کہانیوں کی تلاش اور پیش کاری کے لیے مشہور تھیں۔ "دوسری شادی" ایک طویل کہانی ہے جو وکٹورین معاشرے میں خواتین اور محنت کش طبقے کے افراد کو درپیش مشکلات کو اجاگر کرتی ہے۔ انسانی رویوں کے بارے میں اس کی گہری بصیرت اور متعلقہ اور جاندار کرداروں کو تیار کرنے میں مہارت، افسانے کی کہانی جاندار ہو گئی ہے۔ افسانے میں پیش کی جانے والی جزئیات نگاری، جذبات نگاری اور کہانی کاری دراصل گاسکل کی سماجی جڑت کا حاصل ہے جو چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات کو مشاہدے کی گہری صلاحیت اور تخلیقی وجود کے باریک پہلوؤں کی گہری سمجھ کے سبب جذبات کو سمجھنے اور بانٹنے کی سہولت مہیا کرتی ہے۔ جذبات نگاری کو پیش کرتے ہوئے گاسکل رقمطراز ہے:

"ایلسی کے جسم سے کپڑا اُتر چکا تھا اور وہ حریری لباس میں لپٹی ہوئی بہت کمزور سی نظر آ رہی تھی اور نیند میں بھی اس کے چہرے پر پژمردگی ٹپک رہی تھی۔ کانپتا ہوا باپ آنسوں سے بھری ہوئی مشتاق آنکھوں سے اپنی بچی کو دیکھ رہا تھا اور موٹے موٹے آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے۔"(22)

سید عابد علی عابد کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے شماروں میں افسانوں کے تراجم کے حوالے سے ایک اہم افسانہ، ولیم فریر ہاروے (1885ء-1937ء)، کا "اگست کی گرمی" ہے جو عزیز الدین احمد نے ترجمہ کیا اور مجلہ "صحیفہ" کے شمارہ چار میں شامل کیا گیا ہے۔ ہاروے کی مختصر کہانیاں اکثر خواہش، تنہائی اور شناخت کی تلاش کے انہی موضوعات کی عکاسی کرتی ہیں جو ان کے انفرادی خصوصیت کی حامل ہے۔ "اگست کی گرمی" میں افسانوی منظر کشی، بھرپور علامت نگاری اور انسانی جذبات کی گہرائی کہانی بنانے میں کامیاب دکھائی دیتی ہے۔ خطوط کے انداز میں لکھا گیا اس افسانہ میں کہانی کا بنیادی خیال، انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کا پتہ لگانے میں کامیاب ہوتا ہے جہاں خطوط کا باہمی مکالمہ کرداروں کی بنت ارو منظر کی جڑت بناتا ہے۔ کہانی کا پہلا منظر، کہانی کا راپا بنانے کا جواز ہوتا ہے اور ہاروے، یہ جواز یوں پیش کرتا ہے:

"میرا خیال ہے کہ آج کا دن میری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ آج کی تمام واقعات میرے دماغ میں اس وقت تازہ ہیں۔ اس لیے میں چاہتا یہ ہوں کہ جس قدر درستی اور صحت کے ساتھ ممکن ہو میں انہیں قلم بند کر دوں۔"(23)

مذکورہ دور میں مجلہ "صحیفہ" میں شامل ایک اور منفرد افسانہ بنگالی افسانہ نگار عبد الغفار چودھری (1932ء-2022ء)، کا افسانہ "ماس کٹال" ہے جسے سید احمد سعدی نے ترجمہ کیا اور مجلہ "صحیفہ" کے شمارہ تیرہ میں شامل ہوا ہے۔ عبد الغفار چودھری ایک بنگلہ دیشی، افسانہ نگار ہیں جو اپنی پُر تاثیر اور فکر انگیز کہانی کاری کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی کہانیاں انسانی تجربات، سماجی مسائل اور ثقافتی شناخت کی پیچیدگیوں کو تلاش کرتی

ہیں۔ "ماس کٹال"، میں حقیقت پسندی اور افسانوی مہارت کا امتزاج دکھائی دیتا ہے، جو افسانہ نگار کی حساسیت، سماجی جرٴت اور روزمرہ کی زندگی کی باریکیوں سے کشید ی ہوئی کہانی کا وجود بناتی اور قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ کہانی کا مرکزی خیال غیر معمولی حالات کا سامنا کرنے والے عام لوگوں کی زندگیوں کی عکاسی کرتا ہے، جو انسانی زندگی اور بنگلہ دیشی معاشرے کی سماجی حرکیات کے بارے میں بصیرت پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار یہاں مہارت سے کرداروں کو گہرائی اور صداقت کے ساتھ پیش کرتا ہے، جس سے قاری کو کہانی، خیال اور خواہش کی تکوین سے روشنی حاصل کرنے کا سامان مہیا کرتا اور کہانی کے دیگر لوازم کے ذریعے، وہ محبت، دکھ، تکلیف، شناخت، اور دیگر اثرات کی روشنی بانٹتا ہے۔ سماجی جرٴت اور مقامی شناخت بیان کرتے ہوئے چودھری، کچھ ایسا منظر تراشتا ہے:

> "ماس کٹال کا منبع عبور کرنے سے پہلے ہی طوفان کا زور بڑھ گیا تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔۔ ہر طرف رات کی دبیز تیرگی پھیلی ہوئی تھی اور اس تاریکی میں چھپۓ ماچھی کی گم گشتہ راہ، کشتی اور دریا کے سینے پر ہر لمحہ ہوا کے بڑھتے ہوئے زور اور تیز و تند موجوں کے درمیان ایک تنکے کی طرح ناچ رہی تھی۔"(24)

ادبی مجلہ "صحیفہ" نے دنیا بھر کی مختصر کہانیوں کا اردو زبان میں ترجمے شائع کر کے، ایک اہم ادبی کارنامہ ادا کیا ہے۔ افسانوی کہانیوں اور کرداروں کی اردو زبان میں ترجمہ نگاری، جہاں ادبی ترسیل کا معاملہ ہے وہاں تہذیبی و ثقافتی تبادلے کی منتقلی، لسانی تنوع کو فروغ دینے اور ادبی منظر نامہ بڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ دوسری جانب مجلہ "صحیفہ" نے جہاں دیگر زبانوں میں لکھی کہانیوں کو اردو میں متعارف کرایا وہاں عالمی افسانہ نگاروں کی ایک توانا روایت کو اردو کہانیوں کے قاری سے متعارف کرانے کا ذریعہ بھی فراہم کیا ہے۔ مزید برآں، مجلہ "صحیفہ" کی ترجمہ نگاری کی روایت نے بہت سی ثقافتوں اور زبانوں کی مختصر کہانیوں کے ترجمے میں ڈھال کر پیش کر کے باہمی علمی و ادبی تبادلے کی سہولت کاری فراہم کی جہاں بہت سے خطوں کے بیانیے کی نمائش، قاری کو مختلف نقطہ نظر، رسوم ورواج اور بیانیہ تکنیک تک رسائی کا موقع میسر کیا ہے۔ مجموعی طور پر، ترجمہ شدہ مختصر کہانیوں کو اصل زبانوں میں شائع کرنے میں مجلہ "صحیفہ" کا کردار انتہائی قابل قدر ہے جس نے ادبی و ثقافتی تعامل کی سہولت، زبان و بیان کے تنوع کو محفوظ رکھنے، ترجمہ نگاری کے فن اور مترجمین کی مہارت کو عالمی تناظر میں بانٹنے کا پر فعال موقع مہیا کیا ہے۔

حوالہ جات

1. راحیل فاروق، تخلیقِ فن: ایک نامیاتی نظریہ، اردو گاہ۔ برقی بیاض، دہلی، 2017ء، ص 1-5
2. Nancy C. Andreasen, A Journey into Chaos: Creativity and the Unconscious, Published in "Mens Sana Monogr", Vol 9 (1), Medknow Publications, Mumbai, 2011, p.42-53.
3. ظہور الدین، پروفیسر، جموں و کشمیر میں اردو افسانہ، والنٹ پبلیکیشنز، 2021 چنائی، ء، ص 1
4. Maya Angelou, The Secret to Creating Viral Content, Matt Kugel Publishers, Canada, 2018, p. 3.
5. Ernest Hemingway, Story Without End, Author House Publishers, Bloomington, 2013, p. 173.
6. مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ترجمے کا فن، کتابی دنیا پبلشرز، دہلی، 2005ء، ص 28
7. جمیل جالبی، ڈاکٹر، ترجمے کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2014ء، ص 153
8. Nicolas Safetco, How to Translate, Nicolas Safetco Publications, Romania, 2015, p. 245.

9. Italo Calvino, Crossing Cultural Boundaries in East Asia and Beyond, Brill Academic Publishers, New Zealand, 2021, p. 175.

10. جیلانی کامران، ترجمہ: روایت اور فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1985ء، ص23

11. رشید امجد، ڈاکٹر، فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مشمولہ روداد سیمینار: اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2017ء، ص24

12. Goethe, Johann Wolfgang von, 2004, The Invisibility of the Translator: A History of Translation, London, Routledge Publications, p. 99.

13. مسکین علی حجازی، پروفیسر، صحافتی زبان، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2007ء، ص73

14. جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2003ء، ص13

15. سید عابد حسین عابد، ، ڈاکٹر، اردو ادب میں فنِ ترجمہ نگاری کی روایت، ہم سب، لاہور، 2017ء، ص1

16. Maurice Blanchot, The Invisibility of the Translator: A History of Translation, Routledge Publications, London, 2004, p. 308.

17. اناطول فرانسس، "خیابانِ ایقبیور"، مترجم: شیر محمد اختر، مشمولہ: مجلہ "صحیفہ"، شمارہ: 14، مجلد ترقی ادب، لاہور، 1960ء، ص261

18. گائیدی موپساں، "غُولا"، مترجم: سجاد باقر رضوی، مشمولہ: مجلہ "صحیفہ"، شمارہ: 2، مجلد ترقی ادب، لاہور، 1957ء، ص157

19. انطون چیخوف، "بدنصیب"، مترجم: سجاد ترمذی، مشمولہ: مجلہ "صحیفہ"، شمارہ: 8، مجلد ترقی ادب، لاہور، 1959ء، ص191

20. الیگزینڈر پشکن، "تابوت ساز"، مترجم: مسعود سلمان، مشمولہ: مجلہ "صحیفہ"، شمارہ: 4، مجلد ترقی ادب، لاہور، 1958ء، ص173

21. آرنسٹ ہیمنگوے، "دیارِ غیر"، مترجم: عنایت الٰہی ملک، مشمولہ: مجلہ "صحیفہ"، شمارہ: 14، مجلد ترقی ادب، لاہور، 1960ء، ص249

22. الزبتھ گاسکل، "دوسری شادی"، مترجم: سجاد ترمذی، مشمولہ: مجلہ "صحیفہ"، شمارہ: 9، مجلد ترقی ادب، لاہور، 1959ء، ص240

23. ولیم فریر ہاروے، "اگست کی گرمی"، مترجم: عزیز الدین احمد، مشمولہ: مجلہ "صحیفہ"، شمارہ: 4، مجلد ترقی ادب، لاہور، 1958ء، ص181

24. عبدالغفار چودھری، "ماس کٹال"، مترجم: سید احمد سعدی، مشمولہ: مجلہ "صحیفہ"، شمارہ: 13، مجلد ترقی ادب، لاہور، 1960ء، ص141